تصورِ علم کی حقیقت

نسل آدم نے غور وفکر کی عادت اپنے باپ آدمؑ سے وراثت میں پائی ہے، اور آدمؑ کو یہ خوبی اللہ رب العزت نے اس کی تخلیق کے ابتدائی مراحل میں ہی عطا کر دی تھی۔ جب آدم کو اسماء (names) کا علم عطا کیا گیا تھا اسی لمحے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نے کام کرنا شروع کر دیا تھا، اور اس وقت سے آج تک نسل آدم علم اور اسماء کے سربستہ رازوں سے آگاہی میں سرگرداں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہلی نشست کا موضوع **''تصورِ علم''** کی حیثیت رکھا گیا ہے۔ اب تک ہزاروں لوگ اس پر کہہ لکھ چکے ہیں لیکن یہ اس موضوع کی خوبی ہے کہ جب بھی اس پر سوچا جائے کچھ نئے پہلو، روشنی کی کچھ نئی کرنیں اور خیالات کے نئے رنگ نمودار ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ''العلم'' رب کائنات کی ان گنت صفتوں میں سے ایک صفت ہے، اور اللہ نے اپنے خورشید علم کی ایک کرن، انسان کو ہدیہ کر رکھی ہے، اس لیے نہ صفتِ رب کی کوئی حد ہے، اور نہ ہی اس کے کسی ایک حصے کا کوئی کنارا۔

تصورِ علم پر پھر سے غور کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ عہد جدید کے مشینی انداز نے انسانوں کو تیز رفتار تو بنا دیا ہے لیکن جذبوں اور احساسات کو کچل کے رکھ دیا ہے۔ انسان بدنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مادی اشیاء کی محبت میں دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا ہے، اس لیے تصورِ علم کو پھر سے تازہ کر لینے کی ضرورت ہے، اور جب تک تصور واضح اور اچھا نہ ہو عمل کی بنیاد میں نکھار نہیں آ سکتا۔

میں چونکہ زبان وادب کا طالب علم ہوں اس لیے چند الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے تصورِ علم کے سربستہ رازوں میں سے بعض کی نقاب کشائی کی کوشش کروں گا۔

اہل دانش کا کہنا ہے کہ ہر لفظ اپنے اصل معنی سے بندھا ہوتا ہے، چاہے اس کے اصطلاحی معانی اسے کیسے ہی لباس پہنا دیں، معاشرے میں اس لفظ کا استعمال چاہے کیسا ہی ہو جائے لیکن اس کی اصل کا رنگ کسی نہ کسی طرح سے ظاہر ہوتا رہے گا۔

آیئے تصورِ علم سے آگاہی کے لیے علم سے متعلق چند لفظوں پر غور کر لیں، اس لیے کہ کسی خاندان کے بارے میں جاننے کے لیے اس سے متعلق بیشتر افراد کا تفصیلی مطالعہ بہت ضروری ہے، ورنہ تصور ناقص اور خیال آرائی غیر منصفانہ ہوگی۔

عقل:۔ جب بھی ہم علم، حکمت، غور وفکر اور سیکھنے سکھانے کی بات کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان سب کا تعلق عقل سے ہے۔ عقل کیا ہے؟ آیئے دیکھتے ہیں۔ ''عقل'' عربی زبان کا لفظ ہے جو مختلف قسم کے جانوروں کو رسّی یا زنجیر سے پابند کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور اب بھی اس کا یہ معنی استعمال میں موجود ہے۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے ''فلان عَقَلَ الجَمَل'' فلاں شخص نے اونٹ کو باندھ دیا ہے۔ قدیم زمانے سے لفظ ''عقل'' ان ہی معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔

عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک صحرائی آپؐ کے پاس آیا تو آپؐ نے دریافت کیا تھا۔ کیسے آئے ہو؟ صحرائی نے کہا اونٹ پر آیا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا: اونٹ کہاں چھوڑ آئے ہو؟ صحرائی نے جواب دیا: توکلتُ علی اللہ۔ میں نے اللہ پر توکل کیا

ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح فرمائی اور کہا اِعقِلْه ثم توكّلْ ۔ پہلے اسے باندھو، پھر توکل کرو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِعْقِل کا لفظ استعمال فرمایا جو عَقَلَ سے فعل امر ہے۔

لفظ ''عقل'' نے جانوروں کو پابند کرتے کرتے انسانوں کو بھی پابند کرنا ضروری سمجھا، اس لیے کہ جو انسان مختلف آداب، اخلاقی قدروں اور قواعد وقوانین کی زنجیروں سے آزاد ہوجائے وہ درندوں اور جنگلی جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے۔ انسانی معاشرہ اسی شخص کو عقل مند سمجھتا ہے جسے کھانے پینے کا طریقہ، اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ، بات چیت کا ڈھنگ آتا ہو، جسے چھوٹے بڑے کی تمیز، صفائی ستھرائی کا خیال ہو، جو اپنے مالک، ملک اور معاشرے کے قوانین کا پابند ہو، اگر کوئی شخص بیچ بازار میں کپڑے پھاڑنا شروع کردے، آنے جانے والوں سے بدتمیزی کرنے لگے، گلی سڑی چیزیں کھانا شروع کردے، بات بے بات گالیاں دینے لگے، تو سب کہیں گے پاگل ہے، جنون کا شکار ہے، اس لیے کہ جنون عقل کے گم ہونے کو ہی کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے عقل مند انسان وہی ہے جس نے خود کو اخلاقی، معاشرتی قدروں کا پابند بنایا ہو، نہیں تو پاگل، اجڈ اور گنوار کہلائے گا، اور عقل وخرد کے دائرے سے باہر ہوجائے گا۔

حکمت:- خاندان علم کا ایک اہم فرد حکمت بھی ہے، جس کا حوالہ قرآن مجید میں بھی ملتا ہے۔ اللہ نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے ان کی ذمہ داریوں کا جہاں ذکر فرمایا وہاں یہ کلمات کہے گئے:

''وَيُعَلِّمُهُم الكِتَابَ وَالحِكْمَةَ'' (وہ انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے)

یعنی کتاب اور حکمت (دانائی) کی تعلیم دینا مقاصد بعثتِ رسالت میں شامل ہے۔ ذرا غور کیجیے حکمت میں ''ح'' اور ''ک'' پر زبر لگانے سے یہ ''حَـكَـمة'' بن جاتا ہے۔ آپ نے دیہات میں دیکھا ہوگا کہ گھوڑے کے منہ میں جو لگام لگائی جاتی ہے اس کے ساتھ لوہے، چمڑے یا پیتل کا ایک حصہ ہوتا ہے جو گھوڑے کے جبڑے میں رہتا ہے اور وہی اُسے سرکشی سے باز رکھتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں اس لوہے یا پیتل کے ٹکڑے کو، جو گھوڑے کو سرکشی سے باز رکھتا ہے حَكَمه کہتے ہیں۔ اسی کی مدد سے گھوڑے کا سوار اس پر قابو پاتا ہے اور اشارے سے اس کی سمت تبدیل کرسکتا اور اسے مختلف انداز اور رفتاروں سے دوڑا سکتا ہے اور اس کنٹرول (control) میں وہ ''حَكَمة'' اصل کام کرتا ہے۔

حکمت کا لفظ اسی لفظ حَكَمة سے ماخوذ ہے اور اسی سے لفظ حاکم بنا ہے کہ جس کے ہاتھ میں علاقے، خطے یا مملکت کی باگ ڈور ہوتی ہے اور وہ نظام میں پیدا ہونے والی خرابی کو مختلف اداروں کی کارکردگی کے ذریعے قابو میں لے آتا ہے۔ اسی سے لفظ حَكَم بنا ہے جسے Referee بھی کہتے ہیں جو کھیل کے میدان میں نہ صرف دونوں ٹیموں کو کھلاتا ہے بلکہ ان میں نظم وضبط قائم رکھتا ہے اور اگر کوئی کھلاڑی غلط کھیلتا ہے تو ریفری (حَكَم) اُسے تنبیہ کرتا ہے بلکہ کھیل سے باہر بھی کردیتا ہے۔ اسی حَكَم کا اطلاق عملی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی پوری شدت سے ہوتا ہے جب دو افراد یا گروہوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو تو کسی غیر جانبدار شخص کو حَكَم بنایا جاتا ہے تاکہ وہ کسی کی طرف داری کیے بغیر عدل کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کرسکے۔ اس اعتبار سے حکمت وہ علم ودانش ہے جس سے انسان اپنے آپ کو اور دوسروں کو منظّم کرسکتا ہے، اور مختلف حالات میں خرابیوں پر قابو پاکر معاملات کو درست کرسکتا ہے۔

تہذیب:- لفظ تہذیب بھی علم وحکمت کا ساتھی ہے، اسے ہم اکثر ثقافت کے ساتھ جوڑ کر civilisation کے معنی میں بولتے ہیں، لیکن جب تک لفظ کے اندر چھپے ہوئے معنی پر غور نہ کیا جائے اس وقت تک اس کی تمام جہتوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ قدیم زمانے میں علم کی تدوین کا انداز جدید وسائل کی دنیا سے مختلف تھا، علم کے پیاسے مختلف موضوعات پر معلومات جمع کرتے رہتے، کبھی منظّم اور کبھی غیر منظّم دفتر جمع ہو جاتے، بعض لوگوں کے پاس تو تختیاں اور دفتر بھی نہ ہوتے، کوئی ہنڈیا میں معلومات جمع کر رہا ہے، کسی نے چمڑے کا تھیلہ بھرا ہوا ہے، ان کے پاس جمع شدہ مواد کی کیفیت آج کل طلبہ کی نوٹ بک یا notes کی سی ہوتی۔ پھر جب سے فرصت ملتی تو وہ اس جمع شدہ لوازمے کو ترتیب دیتا، اس میں سے غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں کو حذف کر دیتا۔ بعض اوقات جمع کرنے والے اصل فرد کو اپنی زندگی میں اس کا موقع بھی نہ ملتا، اور وہ کوئی کتاب یا صحیفہ ترتیب دینے کی حسرت دل میں لیے جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتا اور اس کے بعد آنے والے یہ کام کرتے۔

دنیا کے بیشتر علوم اسی طرح ترتیب دیے گئے ہیں، کانٹ چھانٹ، ترتیب و تنظیم کے اسی عمل کو تہذیب (editing) کہا جاتا ہے، کسی رسالے یا اخبار کا ایڈیٹر بھی اسی شخص کو بنایا جاتا ہے جو علم وحکمت کے تجربے کی بناء پر اس کام کی نزاکت سے واقف ہو۔

لفظ تہذیب کا سفر صرف قلم وقرطاس کی دنیا تک محدود نہیں تھا اور نہ آج ہے، بلکہ شہروں، بستیوں کی تعمیر وترقی سے بھی وابستہ ہے۔ انسان نے جب جنگل میں قدم رکھا تو اسے ہر موڑ پر خطرات کا سامنا کرنا پڑا، ہر قدم پر ٹھوکر کا اندیشہ رہا، کبھی جنگلی جانور، کبھی خارزار، کبھی دلدل اور کبھی کھائیاں۔ اس نے جنگل میں جہاں نغمہ سرائی کرتے ہوئے خوبصورت پھول، رقص کرتے ہوئے پرند، چوکڑیاں بھرتے غزال اور دھنیں بکھیرتے جھرنے اور چشمے دیکھے، پھلوں سے لدے درخت اور گھنے سایہ دار پیڑ دیکھے، وہیں اسے خوف ناک درندوں، موذی جانوروں اور خارزار جھاڑیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جب اس نے میدانوں کو ہموار کیا، پھولوں کی کیاریاں بنا دیں، جھاڑیوں اور درختوں کی کانٹ چھانٹ کر دی اور درندوں اور موذی جانوروں کو محدود کر دیا تو جنگل کی تہذیب ہوگئی۔ غور کیا جائے تو جس طرح جنگل میں اچھا برا آپس میں ملا جلا ہوتا ہے، انسانی ذہن کی کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ اس میں اچھے برے خیالات بنتے رہتے ہیں اور انسان مختلف تعلیمی مراحل سے گزرتے ہوئے ان کی تہذیب کرتا رہتا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو باقاعدہ تعلیمی عمل سے گزرنے کا موقع نہ بھی ملے تب بھی انسان اپنے ذہن اور ضمیر کی معاونت اور راہنمائی کے نتیجے میں ان بے ہنگم خیالات کو مفید مطلب میں بدل سکتا ہے۔ البتہ یہ خودکار عمل سست ہوگا اور ٹامک ٹوئیوں کی حیثیت رکھے گا جبکہ باقاعدہ تعلیمی عمل کی موجودگی میں یہ عمل تیز تر اور متعین سمت میں جاری ہو جاتا ہے۔

اللہ رب العزت نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے کہ جب سے انسانی نفس کو بنایا گیا ہے اس لمحے سے انسان کے اندر دونوں طرح کے خیالات، افکار اور تصورات (اچھے اور بُرے) بیک وقت اور باہم برسرِ پیکار ہیں۔

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا، فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے متوازن کیا، پھر اس کی بدی اور پرہیزگاری الہام کر دی) الشّمس: ۷-۸

یعنی انسانی نفس کو اللہ تعالیٰ نے بدی اور برائی کا الہام بھی دے دیا ہے۔ اور تقویٰ یعنی اچھائی خوبی، احتیاط اور اللہ کا خوف

بھی الہام کے ذریعے اس کے ذہن اور شخصیت میں ڈال دیا ہے اور کامیابی کا معیار یہ ہے جیسے قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰٮهَا وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰٮهَا (یعنی وہی فلاح پا سکا جس نے اچھائیوں کو پروان چڑھایا اور جس نے (اچھائیوں کو) دبا کے رکھا وہ ناکام ہوا۔

اور یہ نظام قدرت بھی ہے کہ اگر آپ اچھائیوں کو ابھارنا اور نکھارنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے مستقل اور مسلسل محنت کی ضرورت پڑتی ہے جبکہ برائیوں کے فروغ کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی کہ وہ خودرو جھاڑیوں کی طرح خود اُگ آتی ہیں۔ مثلاً اگر آپ کسی مکان کو صاف ستھرا رکھنا چاہتے ہیں تو ہر روز آپ کو بالاہتمام اس کی صفائی کرنا پڑے گی لیکن جہاں چند روز کے لیے آپ نے اس صفائی ستھرائی کے اہتمام کو نظرانداز کیا تو مکان کی ہر شے خود بخود بتدریج گرد آلود ہوتی جائے گی۔ اسی طرح وہ فرد جس نے تزکیہ اختیار کیا اسے کامیابی حاصل ہوئی اور جس نے اچھائیوں کو دبا کے رکھا تو خرابیاں تو اس کے وجود میں در آنے کو پہلے ہی تیار ہوتی ہیں۔

ثقافت:- تہذیب کے ساتھ ایک لفظ ثقافت بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور عرب دنیا میں اسے پڑھنے لکھنے اور تعلیم وتربیت کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص مثقف ہے یعنی پڑھا لکھا، سمجھ دار۔ ثقافت کا یہ لفظ اپنی اصل کے اعتبار سے کجی اور خرابی کو درست کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ قدیم زمانے میں جب جنگیں لڑی جاتی تھیں تو ان میں تلوار، تیر، نیزہ اور بھالا وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ دوران جنگ اگر کسی کی تلوار ٹیڑھی ہو جاتی یا بھالا ٹوٹ جاتا تو اسے کسی ماہر کے پاس لے جایا جاتا تھا جو اسے کوٹ پیٹ کر صحیح کر دیتا اور اسے پھر سے قابل استعمال بنا دیتا، اس کے اس عمل کو ثقافت کہا جاتا تھا۔ بعد میں یہ لفظ انسانی رویوں اور معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور پھر عادات واطوار کی صورتوں کو خوشنما انداز میں ظاہر کرنے کے لیے اس کا استعمال ہونے لگا۔ گویا ثقافت بھلائی یا اصلاح احوال کا ہی ایک نام ہے۔ ان الفاظ پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ علم کا معنی اب صرف جاننا نہیں ہے، بلکہ اچھائیوں اور خرابیوں کو جاننے کے بعد اچھائیوں کو اپنانا اور خرابیوں کی اصلاح کرنا ہے۔ لفظ knowledge میں بھی جاننا، سمجھ دار ہونا، چالاک ہونا اور خوشنما ہونے کا مفہوم شامل ہے۔ اس لیے جب تک کسی شخص میں اس کے عمل اور فکر کے اعتبار سے خوشنمائی نہ ہو، اس کے اعمال، افعال اور گفتگو میں نظم وضبط نہ ہو، اس وقت تک ہمیں اس کے عالم ہونے میں تردّد رہے گا۔

میں ایک دفعہ پھر بحث کو اس نقطے پر مرکوز کرنا چاہتا ہوں کہ اگر علم کو محض جاننا کہہ دیں تو دنیا میں ایسے بے شمار کام ہو رہے ہیں جن کو ہم جاننے کے زمرے میں تو لے آتے ہیں مگر اسے علم کے منصب پر سرفراز نہیں کرتے۔ دُنیا میں لاکھوں کروڑوں سرگرمیاں ایسی جاری رہتی ہیں جن سے فوائد بھی حاصل کیے جا رہے ہیں لیکن ہم نے انہیں علم کا مرتبہ عطا نہیں کیا۔

آپ پوری دنیا کے کسی بھی ملک یا خطے میں چلے جائیں آپ محسوس کریں گے کہ جھوٹ بولا جا رہا ہے، خیانت کی جا رہی ہے، مکر وفریب کا بازار گرم ہے، قتل وغارت گری ہو رہی ہے اور اس کی مختلف شکلیں اور انداز موجود ہیں۔ یہ کام ہو رہے ہیں اور ان کے سرانجام دینے والوں کی بہت بڑی تعداد بھی موجود ہے۔ اس ضمن میں بے شمار قسم کے فن اور فنکار بھی پائے جاتے ہیں، مگر

وفریب میں ایسے ایسے کمالات سے سابقہ پڑتا ہے کہ عدالتیں سر پیٹ کر رہ جاتی ہیں۔لیکن دھوکہ دہی کرنے والے اپنا دامن صاف بچا جاتے ہیں۔لیکن آپ اس دنیا میں کوئی ایک سکول، کالج یا یونیورسٹی نہیں پائیں گے کہ جس میں کبھی یہ اعلان ہو رہا ہو کہ ہمارے ہاں کامیاب جھوٹ بولنے کی تربیت دی جاتی ہے اور مکروفریب کے میدان میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کا یہاں اہتمام کیا جاتا ہے۔اگرچہ یہ کام پوری دنیا میں جاری وساری ہے مگر کوئی اس کا اعتراف کرنے کو تیار نہیں۔خواہ وہ کسی قدر برائی کا عادی اور گناہ کی طرف راغب ہی کیوں نہ ہو چکا ہو۔دراصل وہ علم کے منصب پر اچھائیوں کو بٹھاتا ہے۔وہ برائی دھڑلّے سے کرتا ہے مگر کبھی یہ اعتراف نہیں کرتا کہ میں یہ کام جان بوجھ کر غلط کر رہا ہوں۔برائیاں کرنے کے لیے بھی اسے جمہوریت، شخصی آزادی، جدیدیت اور ایسے خوبصورت الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔خطرناک بموں کو ''ڈیزی کٹر'' جیسے خوبصورت الفاظ میں چھپا کر بیان کیا جاتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں کہ یہ تباہی کے لیے نہیں بلکہ تعمیری منصوبوں میں زمین کو ہموار کرنے کے لیے بنائے گئے ہوں۔دنیا کا یہی چلن ہے، گویا یہ طے ہے کہ محض جاننا علم نہیں ہے اس لیے کہ جس سے انسانی زندگی انتشار اور پھر تباہی سے دوچار ہو وہ جاننا تو ہو سکتا ہے علم نہیں۔گویا علم وہی ہے جس سے انسانی زندگی میں سلیقہ، نکھار، نظم وضبط اور اچھائی آ جائے۔

ادراک:- اسی طرح ہم ''ادراک'' کا لفظ بھی ملتے جلتے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ادراک بھی عربی الاصل لفظ ہے جس کا مطلب ''پہنچنا'' ہے۔

اَیْنَ مَاتَکُونُوا یُدْرِکْکُمُ الْمَوتُ! (یعنی تم جہاں کہیں بھی ہو گے، موت تم تک پہنچ کر رہے گی)۔

اس طرح ادراک کا لفظی معنیٰ پہنچنا ہی بنتا ہے لیکن درحقیقت اس کا اصل مفہوم کسی بات کی ''تہہ تک پہنچنا'' ہے۔اور معلم کا بنیادی کام ہی یہی ہے کہ وہ تعلیم دینے سے پہلے خود علم کی تہہ تک پہنچتا ہے۔یعنی جب وہ کسی بات، کسی نقطے کی اصل (جڑ) تک پہنچے گا تو شاخیں خود بخود اس کے دائرہ ادراک میں آ جائیں گی بلکہ پھلوں اور پھولوں کی تاثیر تک سے اسے آگاہی ہو جائے گی۔

بصیرت:- ایک اور لفظ جو علم ہی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے اور وہ ہے ''بصیرت''۔بصیرت کا بظاہر مطلب دیکھنا ہے مگر اس کا اصل مفہوم غور وفکر کے نتیجے میں اشیاء کی حقیقت تک پہنچنا ہے۔یعنی آپ نے کسی مسئلے پر غور اور تدبر کیا تو اس کی حقیقت آپ کے سامنے آ گئی اور آپ نے حقیقت دیکھنے کے بعد صحیح نتیجہ اخذ کر لیا۔اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر بصیرت کا لفظ استعمال کیا ہے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے سورۂ یوسف کی ایک آیت پر غور کیجیے:

قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِی وَ ھِیَ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ (یعنی یہ میرا راستہ ہے اور میں پوری بصیرت سے تمہیں اس راستے کی طرف بلاتا ہوں)

بصیرت کے ساتھ بلانے کا مفہوم یہ ہے کہ ''میں اس راستے کو جان چکا ہوں بلکہ پوری وضاحت سے اس کی حقیقت سے بھی آگاہ ہو گیا ہوں اور اس کی ڈھکی چھپی باتیں بھی میرے دائرہ علم میں آ چکی ہیں اور اس کے تمام حقائق جاننے کے بعد میں اس کی طرف تم لوگوں کو بلاتا ہوں گویا اشیا کو محض جان لینا علم نہیں ہوتا بلکہ اس کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش بھی کرنا ہے۔علامہ اقبالؒ نے بڑے خوبصورت انداز میں فرمایا۔

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

گویا معلم کا بنیادی کام خود بھی شے کی حقیقت کو دیکھنا اور پھر اس کی صلاحیت طالب علموں تک پہنچانا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

مقصودِ ہنر سوز حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

یعنی انسان نے جو ہنر سیکھا ہے اس کا تعلق چند لمحوں کی سرگرمی تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ ہنر تو انسان کو ابدی سوز سے آشنا کر دیتا ہے اور اسے تشفی اسی صورت میں ہوتی ہے جب اس ہنر کا استعمال زندگی بھر جاری رہے۔ اگر انسان کو کسی فن میں سوز حیات میسر نہیں آتا تو وہ فن ہی نہیں ہے۔ اس میں موجود راحت کا، چنگاری کی طرح ایک لمحے کے لیے چمکنا اور بجھ جانا فن کی محض ایک علامت تو ہوسکتا ہے، فن نہیں ہے۔ اس لیے سوز حیات کا زندگی بھر ساتھ نبھانے کے بجائے شرر کی طرح لمحے بھر کو ظاہر ہو کر ہمیشہ کے لیے کھو جانا تو سرے سے کوئی کمال ہی نہیں۔ اسے تو زندگی بھر کے لیے راہنما ہونا چاہیے۔ علامہ نے یہ بھی کہا:

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا

محض قطرے کی حیثیت سے دھارے میں شامل ہونا تو قطعی بے معنی ہے ایک قطرہ بھی اپنے اندر توانائی رکھتا ہو تو دریا کو متلاطم کرسکتا ہے، اس میں طوفان برپا کرسکتا ہے- یہ تو محض علامت ہے۔ اقبال کا حقیقی تصور یہ ہے کہ انسان میں اگر روحانی توانائی ہو تو وہ پورے ماحول کو انقلاب آشنا کرسکتا ہے۔

علم کا وہ قطرہ جو انسان کے دل میں طوفان برپا نہیں کرتا یا اُسے انقلاب آمادہ نہیں کرسکتا۔ اس کا رُخ کسی نئی سمت کو موڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ کبھی صدف میں گہر بننے کے قابل نہیں ہوتا۔ قطرۂ علم حقیقی معنوں میں انسان کے صدفِ دل میں جاگزیں ہوسکے تو اسے ایک ایسی لامتناہی توانائی عطا کر دیتا ہے جس کے باعث وہ ہمیشہ مضطرب، متحرک، متجسس اور مصروف عمل رہنے کے قابل ہو جاتا ہے اور یوں اس کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی بے کار نہیں گزرتا۔ اس صورت میں انسان کسی بھی لمحے تھک کر نہیں بیٹھتا بلکہ ہر لمحے آگے ہی آگے بڑھتا اور ترقی کی منزلیں مسلسل طے کرتا چلا جاتا ہے۔

فراست:- ایک اور لفظ جو دائرۂ علم ہی میں آتا ہے ''فراست'' ہے۔ فراست بھی کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت کا نام ہے۔ فراست اور بصیرت بظاہر ہم معنی ہیں مگر ان میں ایک باریک سا فرق ہے یوں تو دونوں کا مطلب بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت ہے مگر فرق یہ ہے کہ بصیرت جہدِ مسلسل، طویل غور وخوض اور ذہنی جمع تفریق کے نتیجے میں بات کی تہہ تک پہنچاتی ہے جبکہ فراست وہ فطری ملکہ ہے جو انسان کو کسی بھی آزمائش کے لمحے میں اُسے فی الفور اور براہ راست بات کی تہہ یا مسئلے کے حل تک پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ صاحبِ فراست انسان جو فیصلہ کرتا ہے سننے والے کہتے ہیں کہ ہاں، یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔ آقائے رحمت علیہ السلام کا فرمان ہے:

اتقوا فراسة المومن فانهٔ ینظُرُ بنور اللّٰه

یعنی ''مومن کی فراست کا خیال رکھو کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ نور کی روشنی میں دیکھتا ہے۔''

کیا دین اور دنیا کا علم الگ الگ ہے؟ آپ کے سامنے علم کے حوالے سے ایک اور سوال بھی رکھنا چاہتا ہوں، جو ایک گمراہ کن تصور سے متعلق ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کچھ افراد دین کا علم سیکھ لیں اور کچھ دنیا کا۔ اس طرح ان لوگوں نے خصوصاً مسلم دنیا میں دو طبقات پیدا کر دیے ہیں۔ یعنی ایک گروہ یا طبقہ جو دینی اداروں میں علم حاصل کرتا ہے۔ جبکہ دوسرا طبقہ جو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جدید تعلیم حاصل کرتا ہے۔ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے علم کی افادیت کا اعتراف کرنے سے معذور ہیں۔ وہ ایک دوسرے پر غلط ہونے کے الزام لگاتے رہتے ہیں۔ ہر طبقہ اپنے بارے میں گمان رکھتا ہے کہ وہ زیادہ مفید کام کر رہا ہے اور مخالف طبقہ وقت ضائع کرنے اور عوام کو گمراہ کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ ایک طبقہ کہتا ہے کہ ہم تو آخرت کو سنوارنے کی فکر میں ہیں جبکہ تم محض دنیا طلبی میں لگے ہوئے ہو۔ وہ جواب میں کہتا ہے کہ تمہیں دنیا کی کیا خبر! تم بس مسجد میں جا کے اللہ اللہ کرو، تمہیں دنیاوی معاملات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ ایسے مسائل کے حل کے لیے اپنے اپنے دعووں پر انحصار کرنے کے بجائے اس روشنی کی طرف توجہ کرنا چاہیے جو خالقِ کائنات اور خالقِ علم و عرفان سے ملی ہے۔ چنانچہ آیئے ہم خالق کے اس نمائندے سے پوچھ لیتے ہیں جس نے ہمیں پوری امانت و دیانت کے ساتھ علم سکھایا۔ آپ علیہ السلام نے اللہ کا پیغام دیا: ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَقَ '' (پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے تخلیق کیا)

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ کسی بھی جملے کا مفہوم اسی صورت میں واضح ہوتا ہے جب پورے جملے پر غور ہو۔ ادھورے جملے سے گمراہی کا امکان ہے اور یہ خیانت بھی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم میں اکثریت اقرأ کے بعد فل سٹاپ لگا دیتی ہے اور پورے جملے پر غور نہیں کرتی۔ جملہ اقرأ کے بعد بس نہیں ہوتا۔ بلکہ جملہ ختم ہوتا ہے باسم ربک الذی خلق پر، یعنی اللہ نے صرف یہ نہیں کہا کہ پڑھو، بلکہ فرمایا ہے ''اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے تخلیق کیا''۔ ظاہر ہے جب پڑھنے کو مشروط کر دیا جائے گا۔ اللہ کے پاک اور بابرکت نام سے تو اُسے یہ یقین ہوگا کہ پڑھنے کا عمل اُسے اپنے رب کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس کا علم، اس کی حکمت، اس کی دانش مندی ہر لمحے اُسے اس کے رب کے قریب کر رہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ صحیح سمت میں سفر کر رہا ہے، لیکن اگر وہ علم کے نتیجے میں اپنے خالق (creater) سے دُور ہو جاتا ہے تو یقیناً وہ صحیح راستے پر نہیں چل رہا۔

تصورِ علم کو واضح کرنے والی اس آیت کے دوسرے لفظ (اسم) میں جہانِ علم کے بہت سے راز چھپے ہوئے ہیں جس کا معنی نام ہے، اور اگر آپ دنیائے علم پر غور کریں گے تو پتہ چلے گا کہ سارے علوم، ساری معلومات بلکہ ساری کائنات مختلف ناموں کا ہی مجموعہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ آدم کی تعلیم کا آغاز بھی علم الأسماء (ناموں کے علم) سے ہوا، اور پھر شجرۂ نسب آدم جیسے جیسے پھیلتا، پھلتا اور پھولتا جا رہا ہے، علم الأسماء کے نئے نئے معجزات ظاہر ہو رہے ہیں، یہ رب انسان کی قدرت کاملہ ہے جس نے شجرۂ علم کی پیوندکاری، شجرہ آدم کی شاخِ اول سے کر دی تھی، اور نسل آدم اس کے پھل پھول سے مسلسل فائدہ اٹھا رہی ہے۔

اور دوسری آیت خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَق یعنی اللہ نے انسان کو ''علق'' سے پیدا کیا ہے پر غور کرنے سے جہانِ دانش کا ایسا در کھلتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

''علق'' وہ مادہ ہے جس کے پورے اسرار ابھی منکشف نہیں ہوئے یعنی وہ ابھی پراسرار ہی ہے۔ ہزاروں انسانوں نے یہ بھید جاننے کے لیے تحقیق کی ہے۔ مگر ہر روز اس کے نئے نئے راز کھل رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور شاید قیامت تک اس راز سے پردے اٹھتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اولین دو آیات کا انتخاب اسی حکمت اور مصلحت کے تحت کیا ہے کہ تم نے دین

اور دنیا کو الگ الگ کر دیا حالانکہ ہم نے تو اسے پہلی وحی میں ہی اکٹھا کر دیا تھا۔ یعنی ایک آیت نے دین عطا کر دیا جبکہ دوسری آیت نے علومِ دنیاوی کے راستے کھول دیے۔ انسان اللہ کی مخلوقات میں سب سے زیادہ صاحبِ شرف مخلوق ہے اور انسان کے بارے میں نزولِ قرآن سے وہ حقائق منکشف ہوئے کہ اس وقت کے انسان کے وہم و گمان میں نہ تھے۔ یہ ''علق'' کیا شے ہے۔ اس کے اثرات اب ظاہر ہو رہے ہیں۔ گویا دونوں آیات کو ملا کر پڑھنے سے اقراء کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ اگر ان دو آیات میں فاصلہ رہنے دیا جائے تو حتمی طور پر کچھ لوگ محض دنیاوی تحقیق و تدقیق تک محدود ہو جائیں گے جبکہ کچھ محض فلسفہ والٰہیات کی دنیا میں گم ہو کر رہ جائیں گے اور پھر ان دونوں کا ملاپ مشکل ہو جائے گا۔ اس صورت حال کی وضاحت علامہ اقبال کے اس خوبصورت شعر سے ہو جاتی ہے:

نصیب اوست مرگِ ناتمامے
مسلمانے کہ بے اللہ ہو زیست

وہ مسلمان جو اللہ ہو کے بغیر جی رہا ہو اسے محض ادھوری زندگی میسر آئے گی یعنی وہ جی رہا ہو گا نہ مر رہا ہو گا نہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد ہو گا نہ موت بامعنی ہو گی۔ کیونکہ اس کی زندگی میں تصورِ الٰہ موجود نہیں۔ اس لحاظ سے اللہ نے جو علم ہمیں عطا کیا وہ بہت وسیع ہے۔ علم کے حصول میں ایک اور اہم اصول یہ ہے کہ اگر کسی لفظ کا براہ راست مفہوم دستیاب نہ ہو تو اس کے عکس، ضد یا opposite کی مدد سے مفہوم واضح کیا جاتا ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے دین و دنیا کی اسی بحث میں موجود مغالطہ کو سمجھنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی لغات ڈکشنریاں ہیں کہیں بھی آپ کو دنیا کے مقابلے میں دین کا لفظ نہیں ملے گا بلکہ لفظ ''دنیا'' کی ضد ''آخرت'' ہے گویا دین و دنیا ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔

جبکہ دنیا کو آخرت کے مقابلے میں رکھا گیا ہے۔ چنانچہ یہاں فصل بونے کا ذکر ہے اور آخرت میں کاٹنے کا۔ یہاں عمل کا ذکر ہے اور آخرت میں نتیجے اور صلے کا۔ یہاں امتحان کا ذکر ہے اور دوسری دنیا (آخرت) میں کامیابی یا ناکامی کا۔ جس کو اللہ رب العزت نے جمع کر دیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو بات کہی وہی سب سے بہتر ہے۔

علم کی دنیا کے حوالے سے ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ ایک بار پھر دہرا لیجیے کہ علم کا خاصہ یہ ہے کہ انسان اس راہ پر جتنی منزلیں طے کر لے اور جس قدر بلندی پر پہنچ جائے کم ہے۔ وہ جتنا بھی آگے بڑھے گا اسے اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا اتنا ہی احساس ہوتا جائے گا۔ سارے فلسفیوں اور دانش وروں نے یہی کہا ہے اور خالقِ علم و کائنات نے تو ابتداء ہی میں یہ فرما دیا تھا:

وَمَآ اُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْل ''تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ بہت ہی تھوڑا ہے۔''

علم ایک بہت بڑی کائنات ہے اور اس وسیع کائنات کے ایک چھوٹے سے ذرے یعنی زمین کے تم باسی ہو اور چند علمی گتھیاں سلجھا کر تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ تم بہت زیادہ علم رکھتے ہو۔ لہٰذا کبھی کسی بھی راہ پر چلتے ہوئے راہ کے کسی نقطے کو اپنی حتمی منزل قرار مت دے دینا۔ یہ مت سمجھنا کہ تمہاری منزل تمہیں مل گئی ہے بلکہ مسلسل جد و جہد جاری رکھنا۔ معلم کا بنیادی کام یہ ہے کہ اس کے قدم جستجو کی راہ پر مسلسل آگے ہی آگے بڑھتے چلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اور بڑا ابلغ جملہ ہے) **وَفَوقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٍ** (کہ ہر عالم کے اوپر ایک اور زیادہ علم رکھنے والا ہے)

یعنی آپ علم کی دنیا میں جتنے بھی بڑے عالم کو پائیں، یاد رکھیں کہ وہ سب سے بڑا عالم نہیں ہے۔

میں ۱۹۸۳ء میں جب اسلام آباد آیا اور مارگلہ کی پہاڑیوں کو دیکھا (پہلی دفعہ پہاڑیوں پر نظر پڑی تھی) تو حیران ہوا کہ پہاڑ کتنے بلند ہیں۔ جب مری پہنچا تو پتہ چلا مارگلہ کی پہاڑیاں تو محض ٹیلے ہیں اور جب انتہائے شمال کے پہاڑی سلسلوں پر نظر پڑی تو مری کی پہاڑیوں کی عظمت گہنا گئی۔ انسان بلندیوں تک چلتا چلا جائے اور ہمالیہ کی چوٹی تک پہنچ جائے تو بھی آسمان کے ستارے مسکرا کر کہیں گے ''بس یہاں تک حد ہے تمہاری بلندیوں کی!؟''۔ گویا علم کے راستے میں تھک کے بیٹھنا طالب علم کو زیب نہیں دیتا بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر لمحے طالب علم بنا رہے اور اپنی تحقیق جستجو اور تگ و دو نئے نئے حقائق سے آشنائی کے لیے جاری وساری رکھے۔ اُسے ادراک ہونا چاہیے کہ اس کا علم اور عقل محدود ہیں جبکہ علم جس کی طرف سے آیا ہے اس کی قدرت اور علم ہر لحاظ سے لامحدود ہے۔ چنانچہ محدود صلاحیتوں کے باوجود طالب علم کا لامحدود کی طرف مسلسل سفر ہی اس کی کامیابی ہے اور جب تک ہمارا یہ سفر جاری وساری رہے گا گویا ہم علم کی راہ پر گامزن رہیں گے اور جس لمحے ہم نے سمجھا کہ ہم علم کے عروج پر پہنچ گئے ہیں یقین کیجیے وہی لمحہ ہمارا نقطۂ زوال ثابت ہوگا۔ علامہ اقبال نے فرمایا:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

یہ یقین حصولِ علم کی مسلسل کوششوں ہی کا ثمرہ ہوسکتا ہے ورنہ گمان ہمیشہ ہمارے حقائقِ حیات پر ایک دھند کی طرح چھایا رہے گا۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہیں وہ کارواں تو ہے

علم وحکمت جہاں سے بھی ملے حاصل کرلو۔

علم وحکمت کے بارے میں یہ تصور بھی بالکل واضح رہنا چاہیے کہ یہ کسی نسل، رنگ، خاندان، قوم وعلاقے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اسے مشرق ومغرب کے کسی بھی فرد سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حکمت ودانش پر وراثت کی اجارہ داری ہے نہ کسی ریاست کی، بلکہ یہ ساری نسل آدم کا حق ہے۔ آقائے حکمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران بدر کو صرف اس بنیاد پر آزادی کا پروانہ دے دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں اور اسی بناء پر ارشاد فرمایا کہ ''جہاں بھی حکمت کی کوئی بات ملے، مسلمان اسے اپنی ملکیت سمجھیں۔''

اس ساری بات سے جو نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

۱- علم محض چند اشیاء وافکار کے بارے میں محدود معلومات جان لینے کا نام نہیں ہے، بلکہ ایسی معلومات وافکار کا جاننا ''علم'' ہے جن سے انسانی زندگی منظّم، خوبصورت، خوش کن اور مفید بن سکے اور وہ بدنی وروحانی اعتبار سے راحت واطمینان حاصل کرسکے۔

۲- علم کا اعلیٰ ترین مقصد انسان کو اس کے خالق کی پہچان عطا کرنا ہے تاکہ اللہ کا بندہ اپنے خالق کی پسند کے مطابق زندگی بسر کرسکے۔

۳- علم مادی اور روحانی دنیا میں تفریق کی بنیاد پر ادھورے پن کا شکار ہو جاتا ہے، اس لیے تصورِ علم کی تکمیل کے لیے مادی وروحانی دنیا میں تفریق اور دوریاں پیدا کرنے کے بجائے ان میں یکجائی اور قربتیں پیدا کرنا ضروری ہے۔ انسان نے اس تقسیم کی بنیاد پر بہت نقصان اٹھایا ہے اور اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ دین و دنیا کے الگ الگ تصورات نے انسانوں کو دو ایسے گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے جو ایک دوسرے کے معاون بننے کے بجائے باہم برسرِ پیکار ہیں۔ جبکہ دین کے بغیر دنیا اور دنیا کے بغیر دین کا تصور ناقص، ادھورا اور بے لذت ہے۔ دونوں مربوط ہوں گے تو زندگی میں چین واطمینان ہوگا۔

۴- خزانۂ علم کسی خاص طبقے، گروہ، قوم، یا نسل کی میراث یا ملکیت نہیں ہے بلکہ اس پر ساری نسل آدم کا حق ہے۔ سب لوگ چاہے ان کا تعلق کسی بھی رنگ و نسل اور قوم قبیلے سے ہو ایک دوسرے سے علم حاصل کر سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں نام نہاد ترقی اور روشن خیالی کا دعویٰ کرنے والی قوتوں نے عہد قدیم کی جاہلیت پر عمل کرتے ہوئے بعض علوم کو بعض اقوام کے لیے مخصوص کر دیا ہے اور دیگر اقوام کو ان سے محروم کرنے کے لیے طرح طرح کی پابندیوں میں جکڑ کے رکھ دیا ہے۔ ان علوم میں نیوکلیر فزکس (Nuclear Physics) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

۵- علم محدود صلاحیتوں کے ساتھ لامحدود کی طرف مسلسل سفر کا نام ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

۶- انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا جہالت کی تاریکی سے نہیں بلکہ معرفت کی روشنی سے کی تھی اور یہ روشنی خالقِ انسان نے انسان کو زمین پر بھیجنے سے پہلے عطا کر دی تھی، اور پھر یہ سلسلہ زمانے کے ساتھ ساتھ مسلسل بڑھتا رہا۔